ابوالکلام آزاد کے تفسیری اصول

تفہیم: عبدالباسط پتافی

جب کبھی کسی شخصیت کے کسی بھی موضوع کے حوالے سے قلم اٹھایا جائے تو لازم ٹھہر تا ہے کہ شخصیت پر بھی لکھا جائے مگر یہاں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ابو الکلام آزاد کا نام اس قدر درخشاں ہے کہ ان کا تعارف لکھنا جسارت محسوس ہو تا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ابو الکلام آزاد سے بے خبر ہو یا ان کے کام سے ناواقف ہو لہٰذا ہم اپنے موضوع کی طرف بڑھتے ہیں۔

ابو الکلام آزاد نے قرآن کے حوالے سے اپنے کام کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا

الف) مقدمہ تفسیر

اس میں وہ قرآن کی تفسیر کے اصولی مباحث رقم کرنا چاہتے تھے

(بدقسمتی سے آج یہ مباحث ہمارے پاس نہیں ہیں)

ب) تفسیر البیان

اس میں وہ قرآن کے معارف و مطالب کو بالتفصیل دقیق اور عالمانہ انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

ج) ترجمان القرآن

یہ ان کا سب سے اہم اور پسندیدہ کام تھا اور ان کی نگاہ میں اس کی افادیت بھی بہت تھی اسی لیے سب سے پہلے اسی کی اشاعت ہوئی، اس میں انہوں نے قرآن کا ترجمہ کیا اور حواشی کا انتظام کیا بعد ازاں اس میں توضیح کا اضافہ بھی ہو تا رہا۔

اس تفسیر کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

"پھر ضروری تھا کہ ایک ایسی کتاب اردو میں تیار ہو جائے جس کی نسبت وثوق کے ساتھ کہا جاسکے کہ اس کا پڑھ لینا اور پڑھادینا قرآن کے مقاصد و مطالب سمجھ لینے اور اسے اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھ لینے کے لیے کافی ہے وہ نہ تو اس قدر ضخیم ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعے کے لیے وقت نہ نکال سکے، نہ اس قدر مختصر ہو کہ مطالب کی وضاحت تشنہ رہ جائے اس کی نوعیت ترجمہ ہی کی ہو لیکن ایسا ترجمہ کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو۔" (1)

بقول ابو الکلام آزاد یہ چار جلدوں پر مکمل تفسیر تھی مگر بدقسمتی سے ہم تک ساہتیہ اکادمی کی جانب سے چار جلدوں میں یہ تفسیر محض سورہ نور تک محیط ہے۔

اور آپ نے سورہ فاتحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ تفسیر البیان کو چھوڑ کر وہ اس کے اہم حصوں کو ہر سورہ کے دیباچہ میں لکھیں گے تا کہ آج کا قاری انسیت محسوس کرے۔

بہ ہر کیف، ہم اب اس جانب بڑھتے ہیں کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے یہاں قرآن کی تفسیر کے کیا اصول ہیں؟

ہم نے اپنے شخصی تتبع سے جن اصولوں کو سمجھا ہے وہ بیان کیے دیتے ہیں لہذا جہاں کمی بیشی ہو گی تو اہل علم ملتفت فرمائیں گے۔

پہلا اصول: قرآن اپنے بیان و اسلوب میں فطری اور سادگی کا آئینہ ہے لہذا وہ ہماری کسی بھی وضعی و مصنوعی پابندیوں کا پابند نہیں ہے اور قرآن کو ان وضعی و مصنوعی علوم اور پابندیوں سے سمجھنے کے بجائے اسے فطری طریقے سے سمجھا جائے۔

دوسرا اصول: ہر سورت کا ایک موضوع ہوتا ہے اور تمام سورہ اسی موضوع کے دائرہ میں رہتی ہے۔

اور یہ سوال کہ موضوع کا تعین کیسے ہو گا تو اس کا جواب وہ یوں دیتے ہیں کہ ہر سورہ کی ابتدا وانتہا موضوع جاننے کے لیے کنجی ہے۔(2)

اس کے بعد ایک ضمنی نکتہ یوں لکھتے ہیں:

"جب ہر سورت کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہو گئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلۂ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعوی سے دلیل اور تعلیم سے امثال ونظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے تصرف آیات سے جا بہ جا تعبیر کیا ہے۔ صرف کے معنی لغت میں رد الشی من حالة الی حالة (شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں پلٹانا) کے ہیں۔"

صرف کے یہ معنی انہوں نے راغب اصفہانی سے نقل فرمائے ہیں۔

تیسرا اصول: قرآن کے صحیح فہم کے لیے عربی لغت و ادب کا ذوق سلیم ہونا ضروری ہے۔

اسی لیے وہ کسی مطلب کے لیے شاہد کے طور پر عربی اشعار بھی لاتے ہیں(3) اور مختلف مفردات کے مفہوم کا تعین بھی اسی اصول کے تحت کرتے ہیں۔

چوتھا اصول: قرآن کی تفسیر قرآن سے

ابوالکلام آزاد اس اصول کے تحت کئی ایک آیت کی تفہیم کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کس طرح ایک مفہوم دوسری آیات میں بیان ہوتا ہے جس سے مطالب مزید واضح ہو جاتے ہیں۔

بطور مثال وہ حصہ دیکھا جا سکتا جہاں انہوں نے سورہ قدر کا تقابل سورہ دخان کی ابتدائی آیات سے کیا ہے

اور نکات بر آمد کیے ہیں۔

اور اسی طرح "انا" اور انی" کے فرق کے لیے متعدد آیات لا کر بتاتے ہیں کہ کیوں سورہ قدر میں "انا أنزلناہ" کہا گیا ہے۔(4)

پانچواں اصول: اسلاف کے فہم کو ترجیح دینا

لکھتے ہیں کہ:

"جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے خود صاحبِ کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئیس برس کے اندر بالتدریج نازل ہوا، وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابہ کرام سنتے تھے، نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا خود پیغمبر اسلام ص سے پوچھ لیتے تھے ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ہوئے اور خود پیغمبر اسلام (صلعم) نے اس کی شہادت دی مذہبی جوش اعتقادی کی بنا پر نہیں، بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔" (5)

لیکن یہ بھی واضح رہے کہ وہ اس فہم کو ان آثار ہی کی روشنی میں سمجھتے ہیں جو ان سے خبر واحد کے طریق سے نقل ہو کر آئے ہیں مگر ہر قول جو اسلاف کی جانب منسوب ہو اسے محض نسبت کی وجہ سے قبول بھی نہیں کرتے لہذا رقمطراز ہیں کہ

"ایک طرف تو صحابہ و سلف کی روایات سے تغافل ہوا، دوسری طرف روایات تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت بپا کر دی اور ہر تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی۔" (6)

چھٹا اصول: گزشتہ الہامی کتب

ابوالکلام آزاد قرآن کے مطلب سمجھنے میں تورات، زبور اور انجیل سے بھی مدد لیتے ہیں۔

جیسا کہ سورہ کہف میں "الرقیم" کو وہ مرقوم کے معنی کے بجائے اس شہر کا نام گردانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک توارت میں **راقیم** سے مراد یہی الرقیم ہے جو بعد میں **"پیٹرا"** ہوا جسے عرب **"بطرا"** کہنے لگے۔(7)

ساتواں اصول: تاریخ سے قرآن سمجھنا

وہ نئی تحقیقات اور قدیم تاریخی مصادر سے قرآن سمجھنے کو درست سمجھتے ہیں جیسا کہ ذوالقرنین کون تھے؟ اس کا تعین وہ تاریخی تحقیقات ہی سے کرتے ہیں۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ یہ مصداق کا تعین ہے وگرنہ قرآن کے مفاہیم و مطالب کا تعین وہ تاریخی امور سے نہیں کرتے۔(تاریخ سے مراد تواتر سے پہنچنے والی چیزیں نہیں ہیں)

حوالے

(1) ترجمان القرآن ص8

(2) القول المتین فی سورۃ والتین ص 22

(3) مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی ص 38

(4) قرآن حکیم کی تین سورتیں ص 62-64

(5) ترجمان القرآن ص 36

(6) ترجمان القرآن ص38

(7) اصحاب کہف ص 10